عالم خوندمیری

اقبال اور
تشخص اور تنوع کا مسئلہ

تشخص (Identity) کی اصطلاح، ہماری عام زبان کا ایک حصہ بن گئی ہے جس کو ہم ایک امر واقعہ کے طور پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ تشخص کا بحران (Identity Crisis) ہمارے نزدیک عصر حاضر کا ایک ایسا المیہ ہے جس کے نقوش کی ہم اپنے ادب، فن اور تہذیب کے ہر شعبہ میں تلاش کرتے ہیں۔ ہماری یہ تلاش اور جستجو اس بنا پر یکسر بے معنی نہیں ہے کہ جہاں پچھلی ایک صدی میں ہم نے ذات کا عرفان حاصل کیا وہیں ہم نے اس ذات کو بکھرا ہوا اور منتشر بھی پایا ہے۔ اس انتشار ذات کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اب ہم ذات کو اس کائنات یا عالم سے جس سے ہم وابستہ اور منسلک ہیں اور جس کے بغیر ذات ایک بے سہارا وجود بن جاتی ہے، بے گانہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ بے گانگی اور عرفان ذات ہمارے وجود کے ایسے اجزا بن گئے ہیں جنھیں ہم ایک دوسرے سے جدا کرنے میں اپنے آپ کو ناکام محسوس کرتے ہیں۔ یہ واقعہ صرف دانش وروں کے ایک مختصر سے گروہ تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ اب یہ ہر اس فرد کی تقدیر بن گیا ہے جس پر موجودہ تمدن نے کسی نہ کسی طرح راست

یا بالواسطہ اپنا اثر ڈالا ہے' الفاظ یا اصطلاحیں بے سبب عام زبان کے جزو نہیں بن جاتیں' زندگی کے تجربات' انہیں زبان میں داخل کرتے ہیں اور زندگی کے بہاؤ سے ان میں معانی کا ایک نیا رنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اس بنا پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ایسے الفاظ کے بارے میں سنجیدگی سے غور کریں اور ان میں جو جہان معانی پنہاں ہے ان کی تلاش کریں۔ اس مختصر مضمون کا صرف یہی مقصود ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارا نقطہ آغاز (Point of Departure) کیا ہو؟ یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ تشخص جہاں انفرادی شخصیت کا مسئلہ ہے وہیں یہ انسانی اجتماع یا (Collectivity) سے بھی وابستہ ہے۔ ان دو مختلف سطحوں پر جہاں چند معانی مشترک ہیں' وہیں یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ جہاں گفتگو کی سطح بدلی وہیں نئے معانی اور مفہوم بھی ابھر آئے یا ان کے معیار بدل گئے۔ اگر ہم سہولت کی خاطر' صرف ایک سطح پر غور کرنے لگیں تو اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم تحلیلیت یا (Reductionism) کا شکار ہو جائیں' اس بحث میں الجھے بغیر ابتدا ہی میں اس امر کی وضاحت کافی ہوگی کہ ہم فرد اور اجتماع کی علیحدہ وحدتوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان میں ایک جدلیاتی ربط کو فرض کرسکتے ہیں اور جماعت کو افراد کا ایک فجائی ظہور یا جدلیاتی Emergent قرار دے سکتے ہیں' اسی لیے یہ بے جا نہ ہوگا کہ ہم فرد کو اپنی بحث کا نقطہ آغاز بنائیں اور فرد سے اجتماع کی جانب اپنا سفر جاری رکھیں' فرد کی زندگی میں تشخص کا مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ اچانک سوچتا ہے میں کون ہوں اور "غیر" سے میرا ربط کیا ہے' اگر "غیر" نہ ہوتا تو شاید یہ مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا اور زبان میں صیغہ واحد متکلم بے معنی بن جائے' لیکن صیغہ واحد متکلم کا بھی ایک مقام ہے اور صیغہ واحد مخاطب اور غائب کا بھی' ان میں کامل عینیت نہ صرف زبان کو معدوم کر دے گی بلکہ خود عالم یا World کی نوعیت بھی بدل جائے گی۔ اس لیے یہ مفروضہ

بے معنی نہیں کہ ان صیغوں میں کامل عینیت کم از کم زیست کی سطح پر موجودہ عالمی نظام World Order کے مغائر ہے۔ "فرد" اور "غیر" دونوں تشخص کے حامل ہیں اور ان دونوں میں ایک ربط بھی ہے' بحث کو مختصر کرتے ہوئے صرف یہ وضاحت کافی ہے کہ تشخص اور غیر (Identity And Otherness) کی بنیادوں کی تلاش ہم ان دونوں کے علیحدہ حافظوں اور ان کے جداگانہ اجسام میں کر سکتے ہیں' وہ جس نے اپنا حافظہ کھودیا وہ تشخص سے عاری ہوگیا' اس طرح وہ' جس نے اپنا جسم معدوم کر دیا' وہ بھی تشخص سے بے نیاز ہو گیا۔ میری اپنی انفرادی زندگی' بڑی حد تا ان دوجدانہ ہونے والے اجزا سے عبارت ہے۔ لیکن یہاں ایک معماتی واقعہ یہ بھی ہے کہ حافظہ اور جسم دونوں کے لیے ثبات اور تغیر ضروری اور لازمی شرائط Conditions ہیں۔ تسلسل کا لفظ ثبات اور تغیر کے جدلیاتی ربط کا مظہر ہے۔ دوسرے لفظوں میں Spatio-Temporal Continuity یا زمانی و مکانی تسلسل ہی تشخص عطا کرتا ہے اور دو جداگانہ زمانی و مکانی تسلسل' تشخص اور غیریت کی علامتوں کا اظہار کرتے ہیں اسی لیے یہ دو افراد اپنی الگ الگ سوانح حیات رکھتے ہیں' لیکن یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تشخص اس ثبات کی علامت ہے جو تغیر کے دوران یا زندگی کے بہاؤ میں موجود رہتا ہے یا اس وحدت کا جو اس سلسلہ حادثات کو ایک بامعنی ربط کی صورت عطا کرتا ہے۔ اگر ہم پہلے مفروضے کو تسلیم کرلیں تو اس صورت میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ اس ثبات کا کوئی وجودی مظہر ہمیں ہاتھ نہیں لگتا ہم مزید مفروضوں جیسے روح' یا آتما کی کھوج میں لگ جاتے ہیں اور عالم سے ہمارا ربط ٹوٹ جاتا ہے' عالم مظہری بن جاتا ہے اور انفرادی زندگی میں سوانح یا اجتماعی زندگی میں تاریخ اپنا مفہوم برقرار نہیں رکھتے۔ یہاں تشخص عینیت کا مفہوم اختیار کرلیتا ہے۔ اور انسانی زندگی ایک پہلے سے مکمل طور پر لکھی ہوئی کتاب کی ورق گردانی بن جاتی ہے۔ وہ ایک

خاص مکان میں اپنا ایک مختصر عرصے کے لیے اظہار کرتی ہے اور پھر ثبات کی نذر ہو جاتی ہے' زندگی کے بہاؤ کو معنویت اسی وقت عطا ہوتی ہے جہاں ہم تسلسل کی تلاش' ثبات میں نہیں بلکہ بڑھتی ہوئی گراں تر ہوتی ہوئی اور اضافہ پاتی ہوئی وحدت کو تشخص کی علامت قرار دیں۔ اس مفہوم میں تشخص ایک ایسی وحدت کی شکل اختیار کرتا ہے جو زندگی کے تجربات کو چند اقدار کی روشنی میں مسلسل وحدت عطا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اقدار اور معانی کا ایک نظام تشخص کا دوسرا نام بن جاتا ہے' اور یہی نظام تشخص اور تنوع دونوں پر احاطہ کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تشخص' تنوع میں وحدت diversity Unity amidst کی علامت بنتا ہے اور ثبات اور تغیر کے جدلیاتی ربط کا مظہر بن جاتا ہے۔ اس وحدت کے پھیلاؤ کے لیے ایک زمانی ومکانی نظام لازمی شرط ہے اور چونکہ ہر وحدت کا زمانی و مکانی نظام Order Spatio-Temporal جداگانہ ہوتا ہے' اسی لیے ہر وحدت اس کائنات میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے اور کوئی وجود' لوح جہاں پر حرف مکرر نہیں نبتا۔ یہی زمانی ومکانی نظام اور عالم کی تاریخ میں وہ لمحہ جہاں یہ تشخص اپنا اظہار کرتا ہے اس تشخص کی تقدیر یا Destiny کو متعین کرتا ہے۔ یہی تقدیر ایک شخصیت یا ذات یا Personality کا تشخص بن جاتی ہے دوسرے لفظوں میں تشخص' اس تقدیر یا Destiny کا نام ہے جو تاریخ عالم کے ایک لمحے میں ایک حافظے اور جسم کی وحدت کو اپنی منزل تک پہنچانے میں اور اپنے آپ کو تغیرات کے نظام میں محفوظ رکھنے میں مدد دیتا ہے' یہ منزل ہے' تاریخ کی اجتماعی قدروں کی حفاظت کرتے ہوئے نئی قدروں تک پہنچنا اور حاصل کئے ہوئے جہان معانی کو محفوظ رکھتے ہوئے ایک نئے جہان معانی کی تخلیق کرنا۔ اس مقام پر یہ دعوے بے جانہ ہوگا کہ ہر فرد امکانی طور پر تشخص تو ضرور رکھتا ہے لیکن حقیقی تشخص' اسی وقت ظہور پذیر ہوتا اور عالم وجود میں آتا ہے جہاں حافظہ محض

ایک یا دوں کا انبار نہیں رہتا بلکہ اس زمانی مکانی نظام کو جس میں ہو اپنا وجود رکھتاہے' توسیع دینے اور پھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تعینات کو توڑتا ہوا نئے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹنے میں اور ان سے نئی وحدتوں کی تشکیل میں سرگرداں رہتاہے۔ اگر تشخص صرف محدود گرد وپیش کی دنیا میں سکڑ جائے تو پھر وہ مقامی یا Parochial نوعیت اختیار کرلیتاہے اور عالم یا آفاق سے اپنا رشتہ توڑ لیتاہے۔ یہ تشخص کا اظہار نہیں بلکہ تشخص کا ٹھہراؤ ہے' اس ٹھہراؤ کی دوسری صورت یہ ہے کہ تشخص ماضی یا حال کے ایک لمحہ کے اندرون میں مستغرق ہو جائے اور زندگی کے بہاؤ سے بے نیاز ہو جائے' دوسری صورت میں وہ ایک منجمد حافظہ کی نوعیت اختیار کرلیتاہے جس کو نفسیاتی تجزیے کی زبان میں طفلانہ رجعت یا Infantile Regression کا نام دیا جاسکتاہے۔ بسااوقات وہ واقعہ جس کو ہم تشخص کے بحران یا Identity Crisis کا نام دیتے ہیں اسی رجعت طفلانہ کا اظہار ہوتاہے۔ شخصیت زمانے یا تاریخ کے بہاؤ میں اپنی تقدیر کو متعین کرنے میں ناکام ہوجاتی ہے۔ زمانی مکانی تسلسل ٹوٹ جاتاہے' مکان یا مقام Place بے گانہ نظر آنے لگتاہے جس کی بیشتر صورتوں میں وجہ یہ ہوتی ہے کہ زمانی مکانی تسلسل میں مکاں یکساں نہیں رہتا۔۔ انسانی مکاں کی غیریکساں کیفیت Heterogenity ہی اس کو طبعی مکاں سے ممتاز کرتی ہے جس کی مائیت Homegenity ہے۔ مکان پر زماں یا Time کے Aggresive Encounter کا نتیجہ تاریخ ہے۔ اسی لیے تاریخ صرف زماں سے نہیں بلکہ زماں مکان تسلسل سے تشکیل پاتی ہے۔ اس مقام پر ہم انفرادی تشخص سے اجتماعی تشخص کی جانب اپنے سفر کا آغاز کرسکتے ہیں جس طرح اجتماعی تشخص کے لیے کوئی اجتماعی ذہن Group Mind یا کوئی پراسرار [illegible] وجود رکھتا نہیں ہے۔ اجتماعی تشخص Group Identity اجتماعی [illegible] حافظہ اور کسی اجتماع کے Spatio-Temporal Order

زمانی مکانی نظام سے تشکیل پاتا ہے۔ اگر اجتماعی تہذیبی حافظہ' انفرادی حافظہ کا Counterpart ہے تو مخصوص زمانی نظام انفرادی جسم کا جس طرح انفرادی حافظہ کے لیے ایک جسم اور مکان یا Place درکار ہے اسی طرح اجتماعی تہذیبی حافظہ کے لیے ایک زمانی مکانی نظام بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ کوئی انسانی Aggregate یا مجموعہ اس وقت تک اجتماع یا Group کی صورت اختیار نہیں کرتا جب تک کہ ایک تہذیبی حافظہ اس کے پس منظر میں موجود نہ ہو۔ اسی مشترک و تہذیبی حافظہ سے اجتماعی تشخص ایک زمانی مکانی نظام میں ایک مخصوص اور قابل شناخت پیکر اختیار کرتا ہے اور گماں گزرتا ہے کہ شاید انفرادی ذہن کی طرح کوئی اجتماعی یا گروہی ذہن بھی موجود ہو لیکن مشترک تہذیبی حافظہ افراد کے ایک خاص زمانی مکانی نظام میں تسلسل کا نتیجہ ہے کوئی پراسرار وجود نہیں۔ انفرادی حافظہ کی طرح 'مشترک تہذیبی حافظہ بھی گہری ہوتی ہوئی' گراں تر ہوتی ہوئی اور وسیع تر ہوتی ہوئی وحدتوں کو اپنے اندر سمیٹتا اور اس عمل میں زمانی مکانی نظام کو بھی وسیع تر کرتا ہے۔ یونانی تہذیب کے آغاز سے بیسویں صدی کے آخری دور تک مغربی تشخص Identity Western اس عمل کی ایک نمایاں مثال ہے۔ قومی اور گروہی رقابتوں' باہمی جنگ وجدل' کشت وخون' اور تیز رفتار سماجی معاشی تبدیلیوں کے باوجود' اور انسانی تنوع کے باوصف' مغرب اپنی ایک Identity یا تشخص رکھتا ہے۔ یہاں اس تشخص کے عوامل ترکیبی سے بحث نہیں صرف اس امر کی جانب اشارہ مقصود ہے کہ مخصوص تہذیبی حافظہ اور مخصوص زمانی مکانی نظام اور ان دونوں کا تعامل ایک ایسے تشخص کو جنم دیتا اور برقرار رکھتا ہے جس کی شناخت یا Identification میں ناقابل حل مشکل پیش نہیں آتی۔ یہ تشخص' تنوع میں وحدت بی متنوع تشخص کی ایک مثال فراہم کرتا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر اجتماعی تہذیبی حافظہ طاقت ور ہو اور اس کو

شکست دینے والی قوتیں کمزور ہوں تو تشخص خود کثیر تشخصات یا Idenities Plural کو اپنے اندر محفوظ رکھ سکتا ہے اور ان میں ایک جدلیاتی ربط برقرار رہ سکتا ہے۔ یہ جدلیتی اتحاد درتضاد Unity of Opposites کی ایک تاریخی علامت بن جاتا ہے۔ یہاں اس امر سے انکار نہیں کہ ارضی قومیت Territorial Natationalism نے اس تشخص کو بار ہا دھکا پہونچایا ہے۔ لیکن ایک مشترک تہذیبی ورثے کے شعور نے اس تشخص کو مکمل طور پر منتشر ہونے سے بچالیا۔ صنعتی انقلاب اور ایک مشترک ٹیکنولوجیکل نظام خود اس مشترک تہذیبی ورثہ کے اجزاء بن چکے ہیں۔ لیکن یہاں ایک اہم نکتہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مغرب صنعتی انقلاب سے نہ گزرا ہوتا اور مشترک ٹیکنولوجیکل نظام نہ ابھرا ہوتا تو کیا اجتماعی تہذیبی حافظہ' زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ سکتا۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ مغربی تشخص کے یہی دو اجزاء یعنی صنعتی انقلاب اور مشترک ٹیکنولوجیکل نظام مکانی زمانی تسلسل یا Order Spacio -Temporal یا Continuity کی علامتیں ہیں۔ اسی لیے مغرب میں رجعت طفلانہ کا' جس کو صحافتی زبان میں احیاء پرستی کہا جاتا ہے' امکان کم نظر آتا ہے' بات کو واضح کرنے کے لیے صرف ایک اشارہ کافی ہے سرمایہ داری نظام کا بحران مغرب کو فیڈرل نظام کی جانب بھگائے گا نہیں۔ کیونکہ بالاخر سرمایہ داری نظام اور کمیونزم' دونوں مغربی تشخص کے تنوع کی مثالیں ہیں اور Euro Communism اس تنوع کی ایک تخلیقی علامت!

مشرقی تشخص ایک دوسری صورت حال کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ایک عرصہ دراز تک یہاں تشخص اور ثبات مرادف قرار دیئے گئے۔ مشرق کے مختلف حصوں میں جو تہذیبی تصویر نظر آتی ہے۔ اور جس کو عام طور پر تشخص کے بحران کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ ایک اعتبار سے معانی کے اسی انتشار یا گنجلک کا نتیجہ ہے۔ یہاں تہذیبی حافظہ تو رہا لیکن حافظہ صرف ماضی کے تجربات کی

حفاظت کے مترادف قرار پایا' وہ بڑھتی ہوئی وحدتوں کا اظہار نہیں بنا۔ زمانی مکانی نظام تو تھا لیکن زماں پر مکاں کا تسلط رہا اور ذہن کی حکمرانی۔ زمانی مکانی نظام نے ایک تسلسل میں اظہار نہیں پایا۔ ایک جامد نظام میں محصور رہا۔

اقبال نے اپنے ایک خطبہ میں ابدی قدروں یا تبدیلی کے اصول کے جدلیاتی ربط اور ان کے تصادم پر ان لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے:۔

"اسلام کے نزدیک حیات کی روحانی اساس ایک قائم و دائم وجود ہے' جسے ہم اختلاف اور تغیر میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ اب اگر کوئی معاشرہ حقیقت مطلقہ کے اس تصور پر مبنی ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کا لحاظ رکھے۔ اس کے پاس کچھ تو اس قسم کے دوامی اصول ہونے چاہئیں جو حیات اجتماعیہ میں نظم وانضباط قائم رکھیں کیونکہ مسلسل تغیر کی اس بدلتی ہوئی دنیا میں ہم اپنا قدم مضبوطی کے ساتھ جما سکتے ہیں تو دوامی ہی کی بدولت۔ لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اس سے تغیر اور تبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے۔ اس لیے کہ تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی آیت ٹھہرایا ہے۔ اس صورت میں تو ہم اس شئے کو جس کی فطرت ہی حرکت ہے' حرکت سے عاری کردیں گے۔ اصول اول کی تائید تو سیاسی اور اجتماعی علوم میں یورپ کی ناکامیوں سے ہو جاتی ہے۔ اصول ثانی کی عالم اسلام کے پچھلے پانچ سو برسوں کے جمود سے' جو اگر ٹھیک ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی ہیئت ترکیبی میں وہ کون سا عنصر ہے جو اس کے اندر حرکت اور تغیر قایم رکھتا ہے؟ اس کا جواب ہے اجتہاد۔۔۔"

(چھٹا خطبہ)

اقبال نے جن لفظوں میں اسلام اور مغرب کی جو تصویریں پیش کی ہیں وہ شاید آج کے اسلامی مشرق کی پوری طرح عکاسی نہیں کرتیں بلکہ مغرب کی تصویر کچھ حد تک مسخ شدہ (Distorted) نظر آتی ہے اس سے ہٹ کر"

ابدی اصول" کی اصطلاح بھی ذراسی ترمیم طلب ہے اس کے بجائے ہم Abiding principles کی ترکیب استعمال کریں تو اسلامی مشرق اور مغرب میں ایک حد تک یکسانی نظر آتی ہے۔ دونوں ان اصولوں کے حامل ہیں لیکن ایک نے ان اصولوں اور تغیر کے جدلیاتی ربط کو پالیا ہے اور دوسرے نے اب تک اس میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے اسی لیے مغرب میں ہمیں تشخص کا تو بحران نظر آتا ہے لیکن جہاں تک مغرب کے ترقی یافتہ سماج کا سوال ہے وہاں ادارات Institution کے ذریعہ گروہی تشخص کے تصادم پر بڑی حد تک قابو پالیا گیا ہے۔ اقبال کے بعد مشرق اور خصوصاً اسلامی مشرق مسلسل تغیر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ جس کا اقبال نے خطبات کے بعد کی شاعری میں اظہار کیا ہے مثلاً (ساقی نامہ) لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اسلامی مشرق نے آج تک دیرپا اصولوں اور تغیر کے درمیان ربط کے عرفان میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔ اس کی ایک مثال اسلامی اور غیر اسلامی مشرق کے تقابل میں بڑی حد تک واضح ہوتی ہے۔ اگر یہاں ہم بحث کو Distortion (انحراف) سے محفوظ رکھنے کے لیے صرف ان غیر اسلامی سماجوں پر نظر رکھیں جنھوں نے غیر کمیونسٹ Non-Communist راستہ کو اپنایا ہے تو شاید مسئلہ بڑی حد تک واضح ہو جائے۔ غیر اسلامی اور اسلامی سماج دونوں کسی نہ کسی طرح تشخص کے بحران کا شکار ہیں کیوں کہ ان دونوں سماجوں میں تہذیبی حافظے کے شعور اور زمانی مکانی تسلسل کے درمیان ربط ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ بحث کو واضح کرنے کے لیے ایک طرف ہندوستان کا تہذیبی نقشہ سامنے رکھ سکتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی مشرق کا' پہلی مثال میں ہم ایک اہم Abiding Principle وحدت یا Unity کا ہے اور دوسری طرف دین کی جامعیت کا۔ پہلی مثال میں اہم مسئلہ وحدت درتنوع Unity in Diversity کے اصول کی حفاظت ہے تو دوسری طرف معاملہ تنوع کے انکار کا۔ پہلی مثال میں حل یہ ہوسکتا ہے کہ

مسلمہ اداروں جیسے وفاقی تشکیل یا (Federal Structure) کی اس طرح توسیع کی جائے کہ وہ ان تنوعات یا Diversities کو اپنے اندر سمو سکے اور ہر گروہ اپنے تہذیبی حافظہ اور مکانی زمانی تسلسل کو ٹوٹتا ہوا محسوس نہ کرے یا وفاقیہ Federalism کے تصور میں ایسی لچک پیدا کی جائے کہ وحدتوں کو ذیلی قومیتوں کی نوعیت عطا کر سکے اور عظیم تر ارضی وحدت یا unity Greater territorial کو ایک ابدی اصول کا درجہ نہ دیا جائے۔ اس مثال میں مسئلہ یا Problem ارضی قومیت کو جسے اقبال نے Earth-Rootedness کا نام دیا ہے اور تہذیبی وحدتوں کے درمیان تصادم کا ہے اور ان کے حل کے لیے پچھلی تاریخ سے نہیں بلکہ دور حاضر کے تجربات سے جن کا اظہار ادارات میں ہوتا ہے' مدد لی جاسکتی ہے لیکن اسلام میں صورت حال مختلف ہے یہاں تصویر کافی پیچیدہ اور فن کی زبان میں Surrealistic نظر آتی ہے۔ فرد اور گروہ دونوں ماضی کے جبر کا شکار ہیں۔ ایک طرف وہ جنھیں ابدی اصول کہا جاتا ہے فرد کی تخلیقی صلاحیتوں پر روک لگاتے ہیں تو دوسری طرف گروہوں کی نئی آرزوؤں اور تمناؤں کو ابدی اصولوں سے انحراف کا نام دیا جاتا ہے۔ اقبال کی بصیرت اسلام کی صرف غیر ارضی پہلو پر مرکوز رہی اور اس نے فرد اور گروہ کی زندگی کے دوسرے اصول Place کو کم تر اہمیت کا مستحق قرار دیا۔ ہر چند اقبال نے اپنے اسی خطبہ میں ارضی قومیت سے مصالحت کوشش کی ہے لیکن تبدیلی کے جس اصول کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی اجتہاد وہ بھی ایک اعتبار سے حال کا حل' ماضی میں تلاش کرنے کے مرادف ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی دنیا یا اس کے مختلف حصے خود ایک مستقل تشخص یا Indentity کے حامل ہیں یا ایک Identity Monoligthic کی تصویر فراہم کرتے ہیں جس امر کو ہم اسلامی تشخص قرار

دیتے ہیں وہ خود ایک Cluster of Identities ہے ایسے تشخصات کا جن کے تہذیبی حافظے بھی جدا ہیں اور Temporal Continuity Spatio بھی مختلف' اسی لیے اجتہاد کے ادارے یا تصور کو مشکل ہی تغیر اور تشخص کے تصادم کا حل قرار دیا جاسکتا ہے' سنی اسلام پر کسی نہ کسی طرح علماء کی گرفت بر قرار رہے گی اور شیعہ اسلام' امامت فقیہ کے تصور میں اسیر رہے گا۔ یہاں اقبال کی بصیرت کچھ دور تک ہی ہماری رہنمائی کرسکتی ہے لیکن خود ماضی کے پیدا کردہ تضادات میں گھر جاتی ہے۔ اقبال نے نئے دور کی آواز سنی تھی جس کی جھلک ہمیں اسی خطبے میں نظر آتی ہے' لیکن اس نے حل ماضی کے ایک Institution میں تلاش کیا۔ اس مضمون کا ایک پیش مفروضہ Presupposition یہ ہے کہ اسلامی سماج کے لیے سیاسی' سماجی اور تہذیبی مسائل کا کوئی ایسا حل تلاش کرنا آسان نہیں ہے جس کو ہم اسلامی حل کا نام دے سکیں۔ اسی لیے حسب ذیل Propositions پر نظر رکھنا ہوگی:۔

۱۔ اس وقت کوئی ایسا وجود نہیں ہے جس کو ہم قطعی معنوں میں اسلامی دنیا کا نام دے سکیں۔

۲۔ جس خطہ ارض کو ہم اصطلاحی آسانی کی خاطر اسلامی دنیا کا نام دیتے ہیں وہ خود کئی دنیاؤں کا مجموعہ ہے۔

۳۔ اسلام کے Abiding اصول اس کے قانونی نظام' میں نہیں ڈھونڈے جاسکتے بلکہ انہیں اس کے اخلاقی اور روحانی vision میں ڈھونڈا جانا چاہیے جن کا اظہار متنوع ادارات میں ہوسکتا ہے۔

۴۔ اسلام ایک توانا اخلاقی اور روحانی نظام تو عطا کرسکتا ہے لیکن کوئی نیا عالمی نظام یا World Order فراہم نہیں کرسکتا۔

ان مفروضوں کی روشنی میں اسلامی تشخص یا Identity Islamic اپنا اظہار مقامی یا مکانی تنوعات ہی میں کرسکتا ہے۔ ارضی قومیت

جس کو اقبال نے Earth-Rootedness کا نام دیا ہے اس وسیع تر اسلامی تشخص کے لیے ایک ضروری شرط ہے' تمدن صرف زمانی Category نہیں ہے' زمانی مکانی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک Structure اور ہر Structure مکاں یا Place کا متقاضی رہتا ہے۔ خود اقبال کو جس نے اپنی شاعری میں قومیت کے تصور کے خلاف اپنی شاعرانہ آواز بلند کی تھی' خطبات میں اس اصول کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس لیے کہ وہ خطبات میں Rigorous فلسفیانہ فکر کر رہا تھا۔ اس نے جب فلسفیانہ فکر کی' تب محسوس کیا کہ اسلامی تشخص' محض روحانی اصول کے طور پر کارفرما نہیں رہ سکتا۔ اس کی شناخت یا Identification کے لیے قومیتوں کا Structure ضروری ہے' اور وہ اپنا اظہار مختلف صورتوں یا قالبوں ہی میں کر سکتا ہے۔ تہذیبی حافظہ' محض آفاقی یا Cosmopolitan نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف زمانی تسلسل میں محفوظ نہیں رہ سکتا' اس کے تاریخی بننے کے لیے مخصوص مکانی نظام بھی ایک لازمی شرط ہے تاریخ دراصل Space-Time Structure ہے اور اسی لیے کوئی بھی مفکر جو Rigorous Thinking کرنے پر مائل ہو' اس Structure سے اپنے آپ کو بے نیاز نہیں کر سکتا۔ اقبال کی سیاسی فکر کا وہ لمحہ بڑا اہم ہے جب اس نے اسلام کی روح کی بازیافت کے لیے ایک مخصوص خطہ ارض کی ضرورت کو محسوس کیا' ایک اعتبار سے یہ لمحہ ان شاعرانہ لمحات کا انکار ہے جب اس نے مرد مومن کے لیے دلی' اصفہان اور سمرقند کی شرط سے انکار کیا تھا۔ فکری اعتبار سے یہ اس بات کا اعتراف تھا کہ جہاں نفسی کیفیت زمانی دوراں یا Duration میں کشف حاصل کرتی ہے وہیں تمدنی یا تاریخی فرد' ایک Structure کا طالب ہوتا ہے جس کے لیے Place درکار ہے اسی لیے شخصیت کے قومی اور علاقائی پہلوؤں میں کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے۔

اقبال کا دوسرا اہم فکری تقاضا جس کو اس نے فرد کی روحانی یا نفسی

آزادی Spritual Emancipation کا نام دیا ہے' ایک اور سمت کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ اپنی روحانی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے ایک Super-Imposed جماعت یا اجتماع سے جس کا کوئی ارضی مرکز نہیں ہے زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرے' مختصر لفظوں میں "روحانی آزادی' فرد اور ایک بین الاقوامی امت' کے تضاد کا شکار بن جاتی ہے۔ خودی کے اسرار بے خودی کے رموز کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خطبات میں اقبال نے بالاخر امت کو ایک League of Nations ؟ Status عطا کرنا چاہا لیکن اگر ہم اس تاریخی واقعہ کو اپنی نظر کے سامنے رکھیں کہ اسلامی تشخص' تاریخ کے بہاؤ میں متضاد اور متصادم تشخصات کی ایک مثال ہے تو اس صورت میں جمیعتہ اقوام کا یہ تصور کسی روحانی تقاضے کی تکمیل یا تشفی نہیں کر سکتا۔ اقبال نے اس بات کا اعتراف تو نہیں کیا لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے غیر شعوری طور پر اسلامی دنیا کے لیے ایک غیر قومی کلیسا کی ضرورت کو فرض کر لیا تھا۔ لیکن اسلام کی صورت میں ایسی جمیعتہ اقوام وہی فرائض انجام دے گی جو کوئی دوسری علاقائی جمیعت کر سکتی ہے اس لیے اس کے وسیلے سے ایک آفاقی یا کلی اسلامی شخص کی ضمانت حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب اقبال نے اپنے اسی خطبے میں' جس کی طرف پچھلے صفحوں میں اشارہ کیا گیا ہے' ریاست اور دین کی جدائی کے اصول سے مصالحت کر لی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اسلامی تشخص کے لیے ایک روحانی اخلاقی اصول کو کافی تصور کر لیتا اور Islamic Polity کے غیر تاریخی تصور سے دست کش ہو جاتا۔ اس صورت میں پہلے چار خطبات میں انسانی فرد کے روحانی ارتقاء کی جو سمت متعین کی تھی اور جس کے لیے راہ دریافت کی تھی اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ آسان لفظوں میں' اسلامی فرد' کسی بھی ارضی تشخص کا پابند ہوتے ہوئے وجدان اور کشف کی سمت میں گامزن ہو سکتا ہے۔ اور یہی اسلامی

صوفیا کا راستہ تھا۔ اس صورت میں اقبال کا مثالی فرد ایک نیا روحانی تشخص کرتا ہے جو صحیح معنوں میں Earth Rootedness سے آزاد ہوتا اور ایک معتبر آفاقیت کا حامل ہوتا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ خود اقبال کی Identity کئی Identities کا مجموعہ تھی اور ان میں سے ہر Identity اپنا حصہ طلب کر رہی تھی۔

☆ ✶ ☆